محمد آفتاب شیخ

جدید حیاتیاتی علوم اور اسلام

ـــــ ایک جائزہ ـــــ

○

ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کی طرف سے 'جدید حیاتیاتی علوم اور اسلام" کے نام سے ایک کتاب حال ہی میں اردو زبان میں شائع ہوئی ہے۔ یہ ۱۶۴ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کی قیمت ساٹھ روپے ہے۔

اس کتاب کے مصنف ابوالحسن محسن ابراہیم ہیں جن کا تعلق ڈربن، جنوبی افریقہ سے ہے جہاں سے پہلی مرتبہ یہ کتاب انگریزی زبان میں اشاعت پذیر ہوئی۔ اس کے بعد جناب اسرار احمد خان نے اسے اردو قالب میں منتقل کیا اور بھارت سے شائع ہوئی۔

کتاب میں متعدد حیاتیاتی امراض اور مسائل پر شرعی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ علاج کے لیے طبی طریقوں کی دریافت و ایجاد کے باعث کئی حیاتیاتی معاملات و مسائل ایسے ابھرے ہیں جو مسلمانوں کو شرعی نقطۂ نظر سے غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ ان میں برتھ کنٹرول (خاندانی منصوبہ بندی)، اسقاطِ حمل اور بانجھ پن جیسے مسائل شامل ہیں۔ اس کتاب میں آیاتِ کریمہ، احادیثِ مبارکہ اور مختلف فقہا و علما کے حوالوں کی وساطت سے ہر سہ مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے اور ان کی شرعی حیثیت نہایت عالمانہ اور محققانہ شرح و بسط کے ساتھ متعین کرنے کی

سعی کی گئی ہے؛ چونکہ یہ کتاب ان موضوعات پر لکھی جانے والی اوّلین کتب میں سے ہے، لہٰذا امید کی جاسکتی ہے کہ موضوع کے اعتبار سے یہ کتاب علمائے اسلام کے لیے فکر و تدبّر کے نئے دریچے کھولنے کا آغاز ثابت ہوگی۔

مجموعی طور پر کتاب چار حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ "اسلام اور صحت" کے عنوان سے موسوم کیا گیا ہے جو "حفظانِ صحت" اور "طبی اخلاقیات" کے ذیلی عنوانات پر مشتمل ہے۔ حفظانِ صحت کے تحت جو باب قائم کیا گیا ہے اس میں کائنات میں بنی نوع انسان کی حیثیت اور مقصدِ وجود کے حوالے سے اختصاراً اظہارِ خیال کیا گیا ہے اور قرآن و حدیث کی روشنی میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ انسان کی جسمانی اور روحانی صحت اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر میں کس قدر اہمیت رکھتی ہے۔

اس ضمن میں ایک حدیث نقل کی گئی ہے؛ آپؐ نے فرمایا:

"تمہارے پاس دو علاج ہیں، شہد اور قرآنِ کریم"[۱]

اس حدیث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ جسمانی صحت کا بھی خیال رکھیں اور روحانی صحت کا بھی ـــــ شہد بعض جسمانی امراض کے لیے شفا بخش ہے جبکہ قرآن روحانی بیماریوں کا علاج ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے پیروؤں کو طبی علاج کرانے کی تاکید فرمائی ہے۔ اس کے علاوہ آپؐ نے بیماریوں کے تدارک کے لیے کسی مخصوص طریقِ کار کا پابند نہیں کیا۔ اس کا مطلب ہے کہ مسلمان کسی بھی طریقۂ علاج سے رجوع کر سکتے ہیں اور یہ کہ جدید حیاتیاتی طبی ذرائع کا استعمال ان کے لیے جائز ہے۔ مزید براں آپؐ کا ارشادِ مبارک ہے:

"ہر مرض کا علاج ہے"[۲]

یہ حدیث مسلمانوں کو طب کے شعبے میں تحقیق و تلاش کی ترغیب دیتی ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ موجودہ دور میں تحقیق و دریافت کا سہرا غیر مسلموں کے سر ہے۔

کتاب میں یہ پہلو تشنہ نظر آتا ہے کہ غیر مسلموں کی دریافت مسلمانوں کے لیے کس حد تک اور کس پیمانے کے تحت جزوی معاملات و مسائل میں قابلِ قبول ہے۔ غیر مسلموں کی اپروچ بعض صورتوں میں مسلمانوں کے برعکس ہے۔ مثلاً "طبی اخلاقیات" کے باب میں فاضل مصنّف کے مطابق:

"ترقی یافتہ صنعتی ممالک میں موت کی حتمیت سے انکار کا کچھ رجحان پایا جاتا ہے۔ ان کی دانست میں موت کو ناگزیر حقیقت تسلیم کرنا قدرت کے مقابلے میں انسان کی شکست کے مترادف ہوگا۔ اسی لیے ان ملکوں میں موت پر فتح پانے کی غرض سے بہت سے لوگ کئی منصوبوں پہ کام کر رہے ہیں۔ ان ملکوں کے لوگوں کا خاص مسئلہ یہ ہے کہ وہ انکارِ موت پر مبنی ثقافت کا حصہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حیاتیاتی طبی سائنس کے میدان میں جو بھی یافتیں ہوتی ہیں ان کا بنیادی مقصد موت پر "فتح" پانا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پہ اکسٹھ سالہ ریٹائرڈ ماہرِ دنداں بارنی کلارک کو ۱۹۸۲ء میں سب سے پہلے مصنوعی دل لگایا گیا تھا۔ جب اس کا انتقال ہوا تو ٹی وی سے اس کی موت کی خبر نشر کی گئی لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا کہ مصنوعی دل (انسانی یافت) اب بھی دھڑک رہا ہے۔"

اسی باب میں قدیم و جدید طبی اخلاقی نظریات بیان کیے گئے ہیں اور مسلمان ڈاکٹروں کی امتیازی خصوصیات اور ضابطۂ اخلاق کی نشاندہی بھی کی گئی ہے لیکن یہ پہلے دو ابواب اپنے موضوعات کے اعتبار سے جن اساسی اور تفصیلی مباحث کے متقاضی تھے ان سے کسی حد تک اغماض برتا گیا ہے جبکہ اس ابتدائی حصے کو الگ ابواب میں مذکور مسائل و معاملات کے لیے ایک جامع پیڈسٹل اور معیار فراہم کرنا چاہیے تھا۔

کتاب کا دوسرا حصہ ضبطِ تولید کے موضوع سے متعلق ہے۔ اس حصے کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے:

پہلا باب: "مقصدِ نکاح"

دوسرا باب: "منع حمل اور اسلامی قانون"

تیسرا باب: "مانع حمل تدابیر" اور

چوتھا باب: "ضبطِ تولید تاریخ کے آئینے میں: پاکستان کی روداد" کے نام سے قائم کیا گیا ہے۔

ضبطِ تولید کے سلسلے میں اسلام کے نقطۂ نظر سے ادارۂ نکاح کے اغراض و مقاصد پر

روشنی ڈالی گئی ہے کیونکہ جب ایک مرد اور عورت رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوتے ہیں تو ان کے اتصال کا لازمی نتیجہ اولاد کی پیدائش کی شکل میں نکلتا ہے جبکہ ضبطِ تولید پیدائش کے عمل پہ پابندی کا نام ہے۔ نکاح کی فلاسفی اور معاشرتی زندگی میں اس کی حیثیت کو نہایت سادہ اور عام فہم انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

"منع حمل اور اسلامی قانون" کے باب میں قرآن وحدیث کی روشنی میں ضبطِ تولید کے مختلف پہلوؤں پہ نہایت جامعیت کے ساتھ بحث کی گئی ہے اور اس ضمن میں پانچوں مکاتبِ فقہ کی آراء قلم بند کی گئی ہیں۔

پانچویں باب میں مانع حمل تدابیر کی شرعی حیثیت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور جدید طبی طریقوں کے استعمال اور نتائج کو شرعی نقطۂ نظر سے پرکھا گیا ہے۔

چھٹے باب میں ضبطِ تولید کے سلسلے میں عالمی اور پاکستانی تحاریک اور مختلف نقطہ ہائے نظر کی تاریخی روداد بیان کی گئی ہے۔ یہ باب اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ متضاد زاویہ ہائے نگاہ زیرِ بحث مسئلے کے بیشتر پہلوؤں کو وسیع تناظر میں پیش کرتے ہیں۔

تیسرے حصے میں "حیاتیاتی منی مادریت" کے تحت تین ذیلی عنوانات بنام "بانجھ پن کا مسئلہ"، "حیاتیاتی طبی سائنس اور بانجھ پن" اور "حیاتیاتی تکنیکی طریقوں کا تجزیہ" شامل کیے گئے ہیں۔

بانجھ پن کے علاج کے لیے کل آٹھ طریقے بیان کیے گئے ہیں جن کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ مصنوعی تخم ریزی

۲۔ ٹیسٹ ٹیوب میں عملِ بارآوری

۳۔ بیضہ کی منتقلی

۴۔ مصنوعی جینیت

۵۔ تثبیت جنین

۶۔ عمل تخلیق خارج از رحم

۷۔ کلوننگ یا مرکزہ بیضہ کا عملِ تنصیب

۸۔ قائم مقام مادریت

فاضل مصنف نے آخری چھ طریقے غیر شرعی قرار دیے ہیں جبکہ پہلے دو شرعی لحاظ سے جائز سمجھے ہیں۔ ان میں سے "ٹیسٹ ٹیوب میں عمل بار آوری" کے طریقے پر اگلے صفحات میں چند نکات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

چوتھا اور آخری حصہ اسقاطِ حمل سے متعلق ہے جس کی مختلف حالتوں اور نوعیتوں کو درج ذیل ابواب میں زیرِ بحث لایا گیا ہے:

اتلافِ جنین	جنین کی جنائیت
غیر مطلوب حمل	اسقاطِ حمل کا جواز

اور ـــ جنین کشی کی سزا

اسقاطِ حمل کے بعض ایسے مسائل پر گفتگو کی گئی ہے جن کے بارے میں مصنف نے اگرچہ کوئی حتمی موقف اختیار نہیں کیا لیکن زیرِ غور مسئلے کے متعدد گوشوں کو اجاگر کر کے سوچ و بچار کے لیے راہیں ضرور ہموار کی ہیں۔

مثلاً زنا بالجبر کے نتیجے میں حمل ساقط کرانے کا مسئلہ ـــ معاشرتی، شرعی اور طبی لحاظ سے اس معاملے کا تفصیلاً احاطہ کیا گیا ہے لیکن اس کی ایک صورت کو بدستور سوالیہ حالت میں چھوڑ دیا گیا ہے۔

"حرفِ آخر" کتاب کا پندرھواں اور آخری باب ہے جس میں مذکورہ بالا تمام موضوعات پر طائرانہ نظر ڈالی گئی ہے اور اس بات کو تسلیم کیا گیا ہے کہ ان سب دائروں میں گہری تحقیقات کی ہنوز گنجائش موجود ہے۔

کتاب میں ادق طبی و فقہی اصطلاحات کو اس اسلوب سے برتا گیا ہے کہ زیرِ بحث موضوع بہ احسن و خوبی واضح ہو جاتا ہے۔

اب ہم کتاب کے بعض ایسے پہلوؤں کی طرف آتے ہیں جن پر مزید فکر و تدبر کی گنجائش موجود ہے۔

ضبطِ ولادت ایک دیرینہ مسئلہ ہے جس پر کافی بحث و تمحیص ہو چکی ہے اور متعدد کتابیں

لکھی جا چکی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں عزل، ضبطِ تولید کے طریقے کے طور پہ رائج تھا۔ آپؐ نے نہ تو اپنے پیروؤں کو واضح طور پر اس سے منع فرمایا اور نہ ہی اس عمل کی حوصلہ افزائی فرمائی لیکن اگر کسی کی زندگی یا صحت کی قیمت پہ اسے جائز قرار دیا جائے تو "اصولِ اضطرار" کے تحت یہ عین مستحسن ہوگا۔

مندرجہ بالا سطور کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ضبطِ تولید کا اطلاق فرد سے فرد تک بدلتا ہے۔ اسی طرح غیر معاشی اسباب کی بنا پہ خاندانی منصوبہ بندی کو کسی ملک میں شرعاً جائز قرار دیا جائے تو ممکن ہے کہ اس ملک کی حد تک وہ روا ہو لیکن دوسرے ممالک کے لیے اس فیصلے (اجتہاد) کا صدور غیر شرعی ہو۔ - - - - - - - - - - - - - - - - - -

- -

- چنانچہ برتھ کنٹرول کا معاملہ علاقائی اور بین الاقوامی سطح پہ بھی متغیر نوعیت کا حامل ہے۔ اس ضمن میں امتِ مسلمہ کے اہل اور جید مجتہدین ہی اس فیصلے کے مجاز ہو سکتے ہیں۔

مصنف کے خیال میں بانجھ پن کو ایک بیماری سمجھ کر اس کے تدارک کی کوششیں کی جانی چاہییں۔ اس بیماری کے علاج کے لیے ٹیسٹ ٹیوب میں بارآوری کا طریقہ بھی رائج ہے۔ مؤخر الذکر طریقہ میں ایک عورت کے بیضہ دان سے ایک پختہ بیضہ نکال کر ٹیسٹ ٹیوب میں اسے بارآور کیا جاتا ہے۔ پھر اسے عورت کے رحم میں واپس پہنچا دیا جاتا ہے۔ وہاں یہ امید ہوتی ہے کہ بیضہ نصب ہو جائے گا اور اپنے وقت پہ ایک نارمل بچے کی شکل میں پیدا ہوگا۔

اس طریقے میں، میرے نزدیک یہ پہلو غور طلب ہے کہ ایک بیضہ شکمِ مادر سے منتخب کیا جاتا ہے اور باقی بیضے ضائع کر دیے جاتے ہیں۔ اگرچہ قدرت بھی عام طور پہ ایک بیضے کا انتخاب کر کے بقیہ ضائع کر دیتی ہے لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک مخصوص بیضے کا انتخاب جو انسانی ہاتھوں کے ذریعے کیا گیا ہے، ایک مکمل انسان کی پیدائش کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ یہ سائنسی انتخاب "احسنِ تقویم" کی ضد بھی ہو سکتا ہے۔ اس طرح کی تکنیک حیاتیاتی بدہیئتی کے امکانات بڑھا سکتی ہے اور نسلوں کے فطری بگاڑ کا سبب بن سکتی ہے کیونکہ انتخاب

قدرتی نہیں بلکہ انسانی ہے۔ اب یہاں اہلِ عقل یہ استدلال کر سکتے ہیں کہ ممکن ہے قدرت کو اسی منتخبہ بیضے کا چناؤ مقصود تھا جو انسانی ہاتھوں کے ذریعے ہوا ــــ لیکن یہ محض راہِ فرار ہوگی۔ یہ بعینہٖ وہی معاملہ ہے کہ کسی فرد کو گولی مار کر ہلاک کر دیا جائے اور کہا جائے کہ اس کی قسمت میں یونہی ہلاک ہونا لکھا تھا اس لیے قاتل کسی سزا کا مستوجب نہیں۔

بانجھ پن کے جدید طبی تکنیکی علاج کے ضمن میں جو پہلا سوال سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ کیا یہ عمل اللہ تعالیٰ کی سنن میں مداخلت نہیں۔ کیونکہ ارشادِ ربانی ہے :

"وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ جس کو چاہتا ہے لڑکیاں عطا کرتا ہے، جس کو چاہتا ہے لڑکے دیتا ہے یا لڑکے اور لڑکیاں دونوں عطا فرماتا ہے اور جسے چاہتا ہے بانجھ رکھتا ہے۔ یقیناً وہ جاننے والا اور قدرت والا ہے۔"[۴۲]

لیکن جس طرح کوئی شخص پیدائشی یا حادثاتی طور پر کسی نقص کا شکار ہوتا ہے تو اسے بیماری تصور کر کے اس کا علاج کیا جاتا ہے، اسی طرح بانجھ پن کی کیفیت یقیناً ایک بیماری ہے جس کے تدارک کے لیے کی جانے والی تدابیر خدمتِ انسانیت کے ذیل میں آتی ہیں۔ البتہ اس بیماری کے علاج کے لیے جو طریقے اختیار کیے جائیں ان کی اخلاقی اور قانونی حیثیت پر غور کرنا از بس ضروری ہوگا۔

دوسرا اعتراض جس کا پہلے بھی ذکر کیا گیا، یہ ہو سکتا ہے کہ اس طرح کا تکنیکی عمل کیا حیاتیاتی بدہیئتی کا آغاز نہیں کر دے گا اور فطری نظامِ تخلیق میں انسانی مداخلت، آئندہ نسلوں کے داخلی اور فطری بگاڑ کا سبب نہیں بن جائے گی (جیسا کہ بعض ڈاکٹروں کی طرف سے اس خدشے کا اظہار بھی کیا گیا ہے)۔ ممکن ہے جدید سائنس فوری طور پر اس سائنسی عمل سے پیدا ہونے والی حیاتیاتی خامیوں اور نقائص کی نشاندہی نہ کر پائے لیکن مستقبلِ بعید میں ایسے غیر متوقع نتائج پیدا ہو جائیں جن کا ازالہ انسان کے بس سے باہر ہو۔ جب تک طبی تحقیق اپنے منتخب بارآور بیضے میں موجود پوشیدہ انسانی خصوصیات اور امکانات کا مستند علم حاصل کرنے کے قابل نہ ہو جائے اور سائنس کی آنکھ ایک مخصوص بیضے کے قدرتی چناؤ کی قابلِ اعتماد بنیاد اور نتائج کی تفصیلات فراہم نہیں کر دیتی اس وقت تک بانجھ پن کے علاج کے لیے اس طبی طریق کو روا نہیں سمجھا جانا چاہیے۔

"جدید حیاتیاتی علوم اور اسلام" میں اسقاطِ حمل اور اس کے دیگر ضمنی معاملات و مسائل کو بھی نہایت متوازن انداز میں اور جامعیت کے ساتھ قلم بند کیا گیا ہے۔

کتاب میں مذکور تمام موضوعات و معاملات جس مرکزی نقطے کے گرد گھومتے ہیں وہ نقطۂ زندگی ہے جس کی وضاحت اختصاراً ان الفاظ میں کی جاسکتی ہے:

> متعدد اسباب کی بنا پر شکمِ مادر میں زندگی کو آغاز سے پہلے روکنا یا زندگی کے آغاز کے بعد اسے ختم کرنا یا زندگی کو معرضِ وجود میں لانے کے لیے مختلف تدابیر اختیار کرنا جبلتِ انسانی کے ان مسائل و معاملات کا بنیادی سبب انسانی احتیاج ہے جسے پورا کرنے کے لیے انسان جدید حیاتیاتی طبی سائنس و ٹیکنالوجی کا سہارا لینے پر مجبور رہے۔ اس مقام پر یہ مسئلہ دو رُخ اختیار کر لیتا ہے۔ ایک جدید سائنس اور دوسرا اسلامی شریعت۔ ان دو پہلوؤں کو کتاب کے موضوعاتی دائرے سے قریب تر کرنے کے لیے مزید دو نکات کا اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ ان میں ایک "جدید طبی طریقے" اور دوسرا "اجتہاد" ہے۔

جدید طبی طریقے چونکہ سائنس کی پیداوار ہیں اس لیے دورِ حاضر میں سائنس اور مسلمانوں کی عملی زندگی کا موضوع ایک وسیع بحث کا میدان فراہم کر رہا ہے۔ یہ بات مسلّمہ ہے کہ سائنس موجودہ زمانے میں غیر مسلموں کے زیرِ قبضہ یا زیرِ تصرف ہے اس لیے اس کا استعمال بھی دیگر شعارِ زندگی کی مانند دینی و اخلاقی حدود کی پابندی کے بغیر نوعِ انسانی کو محیط ہوتا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج اسلام کے پیروکاروں کو اپنی زندگی کے مختلف شعبوں میں کئی چیلنجوں کا سامنا ہے۔ مغربی ممالک نے سائنس و ٹیکنالوجی میں بے پایاں ترقی کی ہے۔ اس سائنسی ترقی نے تیسری دنیا اور بالخصوص مسلم دنیا کے لیے جہاں راحت و آسائش کے سامان فراہم کیے ہیں وہاں بہت سے مسائل بھی پیدا کیے ہیں۔ ان صنعتی ممالک کی اسلامی دنیا کو

مصنوعات کی درآمد کے ساتھ اپنے افکار اور روّیوں کی ترسیل بھی گزشتہ ڈیڑھ دو صدیوں سے جاری ہے۔ مغربی تہذیب و نظریے کی اس مسلسل ترسیل نے عالمِ اسلام کی اجتماعی سوچ کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ امریکی اور یورپی تہذیب و تمدّن کی گمراہ کُن چکاچوند نے مسلم فکر و نظر کو اس حد تک خیرہ کردیا ہے کہ حلال و حرام اور خیر و شر کا فاصلہ روز بروز کم سے کم تر ہوتا جارہا ہے۔ کہیں حق تعیش پسندی کا لبادہ اوڑھ کر باطل سے مل رہا ہے، کہیں خیر، مجبوری کے دامِ فریب میں الجھ کر شر کی قبولیت پر آمادہ ہے اور کسی جگہ عقل و دانش کا سراب حلال کو حرام میں بدلنے کے لیے برسرِ پیکار ہے۔ جس طرح مغربی افکار و نظریات کا وائرس ترقی کے نام پر مسلمانوں کی سیاسی، سماجی اور معاشی زندگی میں سرایت کرتا جارہا ہے اور غیر محسوس انداز میں انہیں اسلامی طرزِ حیات سے دور ہٹا رہا ہے۔ اسی طرح طب کے شعبے میں بھی مسلمان چونکہ تقلیدی حیثیت میں ہیں اسلیے اس بات کا احتمال موجود ہے کہ اندھا دھند تقلیدی روش کے باعث کہیں وہ معصیتِ الٰہی کے مرتکب نہ ہو جائیں۔ سائنس و ٹیکنالوجی کے بڑھتے ہوئے قدم بہبودِ انسانیت کے نام پر احکامِ خداوندی اور شریعتِ محمدیؐ کے اٹل اور ابدی نظام میں رخنہ اندازی کا سبب نہ بن جائیں۔

اسلام سائنسی ترقی کا مخالف نہیں بلکہ وہ فلاحِ انسانیت کی خاطر ذرائع اور تدابیر دریافت کرنے اور انہیں برتنے کی تعلیم دیتا ہے۔

بشرطیکہ وہ ذرائع اسلام کے اساسی اصولوں کی حدود سے تجاوز نہ کرتے ہوں۔ اس وقت سیاسی قوت اور مادی وسائل غیر مسلموں کی دسترس میں ہیں اس لیے مسلمانوں کے لیے یہ ایک چیلنج ہے کہ وہ اس غیر اسلامی معاشرت میں اسلامی طرزِ حیات کی تمام محاذوں پر حفاظت کریں۔

❖

اس کتاب میں جن موضوعات کو احاطۂ تحریر میں لایا گیا ہے وہ کم و بیش سبھی اجتہاد د قیاس کے دائرے میں آتے ہیں کیونکہ ان کے شرعی تعین کے لیے قرآن و حدیث سے براہِ راست رہنمائی نہیں ملتی۔ اجتہاد فقہ اسلامی میں اپنی کڑی شرائط اور معینہ قواعد کی رو سے انتہائی ذمہ دارانہ اور دانشمندانہ طرزِ عمل کا متقاضی ہے۔

دینِ محمدیؐ، زمانے کے فطری تغیر سے ہم آہنگ رہنے، انسان کی سماجی زندگی میں رہنمائی کرنے، عقل و علم اور سائنس و ٹیکنالوجی کی بے راہ روی کو لگام ڈالنے کی ضمانت تبھی فراہم کر سکتا ہے جب باصلاحیت اور سمجھے ہوئے علما اس کارِ نازک کو انجام دیں۔ "اجتہاد" کارِ نازک اس لیے ہے کہ مستقبل کے اسلام کا چہرہ مجتہدین کے فیصلوں کی روشنی سے ضیا پاتا ہے۔

گویا خاتمیت ـــ کاملیت، جامعیت، عدمِ جمود اور توازن کے جن اوصاف کا حسین امتزاج پیش کرتی ہے اس کا اظہار مجتہدینِ اسلام کی دیندارانہ روش سے ہی ہو سکتا ہے:

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

امرِ واقعہ یہ ہے کہ گزشتہ ڈیڑھ صدی سے اجتہادی مسائل حل کرنے کے لیے کوئی عالمی فورم موجود نہیں، اور اگر چند سال پیشتر کوئی ایسا ادارہ معرضِ وجود میں آیا بھی ہے تو وہ تاحال اتنا مؤثر اور فعال نہیں ہوا کہ اسلامی دنیا کے لیے توجہ کا باعث بنا ہو۔ اکثر اسلامی ممالک اپنے معاملاتِ زندگی بدیسی طرزِ حیات کے مطابق چلا رہے ہیں۔ طب کے شعبے میں تو مسلمانوں کی صورتِ حال انتہائی مقلدانہ ہے۔

پچھلی نصف صدی سے ذرائع ابلاغ کے پھیلاؤ نے ساری دنیا کو سمیٹ کر ایک عالمگیر معاشرت پیدا کر دی ہے۔ یہ بین الاقوامی معاشرت ایک آفاقی تہذیب و ثقافت کی زمین ہموار کر رہی ہے۔ مسلم اُمّہ فکر و عمل کے اعتبار سے اس لادین سوسائٹی کا حصہ بنتی جا رہی ہے، یہی وجہ ہے کہ نہ صرف اسلامی دنیا کے مختلف گوشوں سے بلکہ پاکستان کے بعض دانشوروں کی طرف سے بھی فقہ اسلامی کی تدوینِ نو، حتیٰ کہ جو قرآنی احکام نصِ قطعی کے درجے پر ہیں ان پر اجتہاد کے ذریعے معاملاتِ زندگی نئی ڈگر پہ چلانے کے تذکرے کیے جا رہے ہیں۔ ان حضرات کی آیاتِ قرآنیہ کی تاویلات باطنی و قرامطی

تاویلات سے بھی کئی قدم آگے ہیں اور ان کی تعبیرات اسلام کے بجائے کفر کے زیادہ قریب ہیں۔ ایسے طالع آزما ترقی کے نام پر ہر سائنسی طریق و ایجاد کو اپنانا باعثِ توقیر و شرفِ انسانیت سمجھتے ہیں۔ ان مغرب زدہ جدت پسندوں کے علم و ادراک کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ وہ مادی پیمانے کی وساطت سے زمان و مکان کے محدود دائرے میں حکمتِ الٰہیہ کو سمجھنے اور پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انھیں حقیقی علیم و حکیم کے احکام میں مضمر برکات و نوازشات کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ نظر نہیں آتا۔ ان نام نہاد مفکرینِ اسلام کی عقلی توجیہات ایمان و اطاعت کی ضد ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اسلامی احکام و شعار کا عقل و دانش سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ اجتہاد و قیاس کی اساس ہی عقل و استدلال پر قائم ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں عقل و استدلال کا انسانی استعمال، اسلامی تعلیمات کی روح سے مشروط ہے۔ اسلامی تعلیمات کی روح کے مطابق معاملاتِ زندگی کا تعین اور قرآن و حدیث سے استخراج و استنباط محض انگریزی درسگاہوں کے تعلیم یافتہ نہیں کر سکتے کیونکہ سائنس و ٹیکنالوجی کی بے بنیاد ترقی سے استفادہ دینِ مصطفویؐ کی بصیرت کے ذریعے ہی کیا جا سکتا ہے۔ بصورتِ دیگر مغرب کی طرح گمراہی و ہلاکت مقدر ہوگی۔ لہٰذا صاحبِ بصیرت و باصلاحیت علما ہی اس فرضِ منصبی کے اہل ہو سکتے ہیں۔

خردمندوں کو شرعی احکام و تعیّنات کی فلاسفی کے کامل ادراک و تفہیم پر بحث کرتے ہوئے یہ حقیقت پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ انسان کی لاعلمی ایک طرف، اصلاحِ احوال کی خاطر عملی جدوجہد کے سفر کو جاری رکھنے کا سامان فراہم کرتی ہے اور دوسری طرف متوقع نتائج کے حصول کی خاطر رحمتِ خداوندی کی طلب گار ہوتی ہے۔ انسانی محتاجی اور کم مائیگی قادرِ مطلق کے حضور دستِ طلب دراز کرتی رہتی ہے اور جبینِ نیاز جھکاتی رہتی ہے کہ یہی مخلوق کے حقِ بندگی کا تقاضا ہے۔ گویا افقی سمت میں تدبّر و تدبیر کی راہوں سے جہانبانی و جہاں آرائی مقصود اور عمودی سمت میں ایمان و اطاعت کے ذریعے عبدسازی و سرفرازی مطلوب۔

"جدید حیاتیاتی علوم اور اسلام" میں حیاتِ انسانی سے متعلق جن مسائل و معاملات کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے وہ موجودہ عہد کے زندہ مسائل ہیں۔ مسلمان ان مسائل و امراض سے نپٹنے کے لیے

جدید حیاتیاتی طبی سائنس کا سہارا لینے پر مجبور ہیں۔ اسلام اس سائنسی سہارے کی ممانعت نہیں کرتا بلکہ وہ زندگی کی بقا، ارتقا اور صحت مندی کی تلقین کرتا ہے لیکن وہ زندگی کی صرف مادی اور ظاہری صحت مندی اور استواری کا قائل نہیں بلکہ وہ انسان کی باطنی و روحانی صحت مندی اور ارتقا کا بھی متمنی ہے جس کے اٹل اور ابدی احکام انسانیت کی باطنی و خارجی پرداخت کے ضامن ہیں۔

کوئی انسانی احتیاج بظاہر اپنے اندر کتنی ہی شدت، جذبۂ ترحم اور عقلی استدلال کیوں نہ رکھتی ہو ــــ کوئی طبی سائنسی تدبیر کتنی ہی بے ضرر، کتنی ہی فلاح و کامیابی کی ضمانت فراہم کرتی ہو، اگر اسلام کے نظامِ اخلاقیات کو کسی بھی پہلو سے گزند پہنچانے کا باعث بنے گی تو شریعت کے منافی ہوگی۔ یہی عمومی اصول مسلمانوں کی عملی زندگی کے تمام شعبوں میں رہنمائی فراہم کرتا ہے۔

○

حواشی

١۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الطب: جز ۲۔ ص: ۱۱۴۲

٢۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطب: جز ۴۔ ص ۷

٣۔ الضرورة تبیح المحظورات

۴۔ قرآن، ۴۲: ۴۹۔۵۰